فکر اسلامی کا عظیم سرمایہ (۳)

ایک مطالعاتی جائزہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی تحریروں سے اقتباسات

مرتب: محمد موسیٰ بھٹو

مصیبت عبادت کی پریشانی اور دبی ہوئی خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے

چنانچہ ہر ایک مصیبت زدہ شخص کا عبادت کی خواہش کرنا مصیبت کا نتیجہ نہیں ہوتا' بلکہ مصیبت خود عبادت کی پریشانی اور دبی ہوئی خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے' جو فطرتِ نفس کا ایک حصّہ اور ہمیشہ اپنی تسکین کے لئے کوشاں ہے۔ مصیبت کا باعث آرزوئے نفس کی فطرت ہے' جو ایک مکمل دائمی رفیق کے بغیر مطمئن نہیں ہوسکتی اور جو عموماً اور فطرتاً عبادت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

مصیبت' زحمت کے بھیس میں رحمت ہے۔ اگر یہ اتنی شدید ہو کہ انسان کو اپنے نصب العین کی طرف لوٹنے پر مجبور کردے تو اس سے اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے کھل جانی چاہئیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہم صرف مصیبت میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور صحیح نصب العین سے مسلسل تعلق قائم نہیں رکھتے۔ ہم غلط نصب العین اختیار کرنے پر تیار رہتے ہیں اور اپنے حقیقی اور واحد دوست کی پکار پر کان نہیں دھرتے۔ یہ ایک ناشکرگزاری ہے جو ہمارے سوا کسی اور کو نقصان نہیں پہنچاتی ہے اور درحقیقت ہمیں اس کا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے' اس لئے شعور کے ساتھ باہمی تعلق کو عبادت کی باقاعدہ عادات سے قائم رکھنا اور مسلسل بڑھاتے رہنا ضروری ہے۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے ہم اپنے آپ کو غلط نصب العینوں کی کشش سے محفوظ رکھ سکتے ہیں' جو ہمیں گمراہ کرنے اور تکلیف پہنچانے

© rasailojaraid
© rasailojarai

کے لئے ہمیشہ گھات میں لگے رہتے ہیں۔ (ایضاً)

عبادت کا مسلسل تکرار فرد کے لئے عظیم انکشاف کا باعث ہونا

عبادت انسان کا اعلیٰ ترین اور گراں ترین تجربہ ہے۔ یہ شعورِ انسانی کا اپنے ماخذ شعورِ ایزدی سے وصال کا نام ہے۔ یہ نفس کا اپنی منزلِ مقصود کی طرف سفر ہے۔ یہ فرقت زدہ عشاق کی ملاقات ہے' وہ عشاق جنہوں نے ایک دوسرے کی طلب و جستجو میں بے حد مصائب کا سامنا کیا ہوتا ہے۔ عبادت کی عادت کو اگر قائم رکھا جائے تو یہ نفس کو جلد ہی ایک عظیم انکشاف کی طرف لے جاتی ہے۔ نفس ایک آسودگی' طمانیت اور سکون محسوس کرتا ہے۔ گویا کہ اسے جس شے کی تلاش تھی' حاصل ہوگئی ہے۔ یہ وصالِ عشاق آگے چل کر ایک دائمی اتحاد کی شکل اختیار کر لیتا ہے' جسے روز افزوں محبت و اعتماد' زندگی اور تقویت ملتی ہے۔ عبادت کا ہر فعل بشرطیکہ وہ احساسِ محبت کا ایک موزوں اظہار کرے' حسن کے ایک نئے جلوے کو سامنے لاتا ہے اور احساسِ حسن میں مزید شدت و قوت پیدا کرتا ہے۔ محبت اسی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے' حتیٰ کہ یہ ایک زبردست نصب العین بن جاتی ہے اور فرد کی تمام زندگی پر چھا جاتی ہے۔ تمام پرانے نصب العین محض ذیلی خیالات بن کر رہ جاتے ہیں اور ان سے صحیح نصب العین کے رستے میں حائل ہونے کی تمام طاقت چھن جاتی ہے۔ یہ کام مشکل اور صبر آزما ہے' لیکن ہر انسانی کامیابی کے لئے شرط ہے۔ (ایضاً)

عبادت میں نفیٔ ذات کے پہلو کا مضمر ہونا

عبادت میں نفیٔ ذات کا ایک پہلو مضمر ہوتا ہے' جو درحقیقت محبوب کی موجودگی میں نفس کے نامکمل ہونے کے احساس اور اس لئے مکمل ہونے کی آرزو کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نفیٔ ذات محبوب تک پہنچنے کے لئے ایک کوشش ہوتی ہے اور اس لئے اس کا حال تصدیقِ ذات' قوت اور اعتماد ہوتا ہے۔ پُر خلوص ندامت کے سوا جو انتہائی عاجزی' جاں نثاری اور فنائے ذات کا پہلو لئے اور جس کی بدولت آنکھوں سے آنسوؤں کی

جھڑی لگ جائے نفس کو کوئی شے اس کا پہلا مقام نہیں بخش سکتی' کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے نفس ان خواہشات کو ترک کر سکتا ہے جو درحقیقت اس کی اپنی نہیں ہوتیں بلکہ اس کی فطرت کے مخالف ہوتی ہیں۔ غیر پسندیدہ نصب العینوں کی محبت سے جس میں کچھ عرصہ مبتلا ہو کر نفس نے نقصان اٹھایا ہوتا ہے' نفس کو پاک کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ نفس کے جذبۂ محبت کو صحیح نصب العین کے لئے فارغ کرنا ہوتا ہے۔ اشکوں کے اس وضو کے لئے بہترین وقت رات کا پچھلا پہر ہوتا ہے' جب خاموشی' سکوت اور دنیا و مافیہا سے مکمل علیحدگی توجہ وانہماک اور داخلی سعی کے لئے خاص طور پر مفید ہوتی ہے۔ (اسلامی تعلیم' مئی جون ۱۹۷۳ء' مضمون ''عبادت اور وجدان'')

حسن کے ہر تازہ علم کے ساتھ علم میں اضافہ ہونا

صحیح فطرت کے لئے بیگانہ نصب العینوں اور خواہشات کی محبت سے نفس جتنا زیادہ آزاد ہو گا اتنا ہی یہ اپنے نصب العینِ حسن کے زیادہ قریب پہنچ سکے گا۔ حسن کے ہر تازہ علم کے ساتھ نفس نہ صرف خود آزاد ہوتا جاتا ہے بلکہ اپنے علم میں بھی اضافہ کرتا چلا جاتا ہے' یہ زیادہ سے زیادہ خود شعور ہوتا جاتا ہے اور مادّی حجابات سے باہر نکلتا اور آہستہ آہستہ اپنے آپ پر قابو پاتا چلا جاتا ہے۔ علمِ نفس اور علمِ حسن طریقۂ ارتقاء کو لئے ہوئے ساتھ ساتھ بڑھتے ہیں حتیٰ کہ خود شعوری ان انتہائی بلند منازل پر پہنچ جاتی ہے جہاں تک اس مادی دنیا کے اندر رہتے ہوئے نفس کے لئے پہنچنا ممکن ہوتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو انسانی شعور اپنے محبوب یعنی شعورِ ایزدی کے لئے ایک بے پناہ کشش محسوس کرتا ہے' اور کچھ عرصہ تک تو اس طرح باہمی وصال محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی سوئی کسی مقناطیس سے' جب سوئی مقناطیس کے کافی قریب آ جائے تو وہ خود بخود سوئی کو اٹھا لے۔ جب تک نفس اس حالت میں رہتا ہے (اور یہ حالت بہت تھوڑی دیر تک قائم رہتی ہے) یہ اپنی آزادی سے غافل اور زمان و مکاں کی حدود سے ماورا ہو جاتا ہے'

© rasailojaraid

کیونکہ اس وقت یہ زمان ومکاں کے خالق کے ساتھ مل کر ایک ہو چکا ہے۔ یہ تجربہ حیطۂ بیان سے باہر ہے۔ یہ نفس کے انتہائی ارتقاء اور مکمل آزادی کا پتہ دیتا ہے' یہ انسان کے دائرہ علم کی عظیم ترین' انتہائی وجد آور اور نہایت مسرور کن راحت ہے' جس کے سامنے ہر قسم کی لذتیں اور راحتیں ہیچ ہیں۔ اس قسم کی لیکن اس سے کمتر درجے کی بتدریج بڑھنے والی خوشی کا تجربہ ارتقاء پذیر نفس کو پہلے بھی ہو چکا ہوتا ہے اور اسی خوشی نے اسے مزید جدوجہد پر ابھارا ہوتا ہے اور اس کی ہمت بندھائی ہوتی ہے' اب اس کا نقطہ کمال آ پہنچتا ہے۔ یہ خوشی اس قدر مسحور کن ہوتی ہے کہ بعض دفعہ عاشق اس عالم کیف سے واپس نہیں آنا چاہتا۔ لیکن یہ جسارت محبوب کے سامنے گستاخی اور نافرمانی ہے' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن چھن جاتا ہے' نفس مادی دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے' کیونکہ وہ اس تعلق کو قائم رکھنا نہیں چاہتا۔ یہ سزا اس کی اپنی اختیار کردہ ہوتی ہے۔

شدتِ محبت کی وجہ سے عاشق صادق کے احساسات

ایک سچا عاشق نہ صرف یہ جانتا ہے کہ اس کا صحیح مقام ایک عبد (خادم) کا ہے بلکہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ محبت کی انتہائی نتیجہ خیزی صرف عبادت (خدمت) ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی ساری ہستی کے ساتھ' جس میں اس کے قوائے عمل بھی شامل ہوتے ہیں' اپنا سر تسلیم محبوب کے سامنے خم کر دیتا ہے۔ وہ اس کے حضور میں اس نقطۂ نگاہ سے حاضر نہیں ہوتا کہ اپنے آپ کو فنا کر دے' بلکہ اس لئے حاضر ہوتا ہے کہ اپنی منتشر قوتوں کو مجتمع کرے' اپنے آپ کا جائزہ لے اور عمل کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے اس پر تو تیار ہو جائے گا کہ محبوب سے دور رہے' لیکن اس بات کے لئے تیار نہیں ہوگا کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے کہ اپنے آپ کو فنا کر دے۔ چنانچہ جب ارتقاء کا نقطۂ عروج آ جاتا ہے تو وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ محبوب کی آغوش میں چلا گیا ہے' بلکہ یہ کہ محبوب اس کی آغوش میں آ گیا ہے۔ اس کے لئے آخری تجربہ فنائے ذات نہیں' بلکہ تصدیقِ ذات ہے اور

com

اسی سے نفس کی کامل آزادی برقرار رہ سکتی ہے۔ اپنی ترقی کے انتہائی مقام پر بھی وہ اس قسم کا احساس رکھ سکتا ہے کیونکہ وہ نہایت احتیاط سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ احساس اس کے اس جذبۂ خدمت و عمل کی وجہ سے ہے جو اس کی خودشعوری کی ترقی کے دوران میں، جو بلاشبہ نہایت بتدریج ہوئی تھی، غیر متغیر اور غیر متزلزل بن گیا تھا۔ اس نے اپنی اس ریاضت و بندگی کو کبھی مبدائے لذت نہیں سمجھا۔ یہ تو محض ایک ضمنی فائدہ ہے، بلکہ اسے قوتِ اعمال کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ یہی اس کی حقیقی خواہش و آرزو تھی۔ اس کا اصل مبدائے لذت خدمت و عمل تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی روز افزوں قوت سے رضائے محبوب حاصل کرنے کے لئے سرگرم عمل رہا تھا۔ لہٰذا اس کی تمام تر توجہ اس لذت کی طرف مبذول رہتی ہے جو اسے محض صحبت سے حاصل ہوئی تھی۔ اس کے لئے عمل خود صحبت محبوب تھا۔ جب ایسا عاشقِ صادق ارتقائے نفس کے نقطۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے تو وہ کبھی تغافل نفس کی حالت میں نہیں ہوتا، بلکہ اس پر مکمل خودشعوری کی حالت طاری ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے خالق کی محبت میں اتنا ڈوب جاتا ہے کہ وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ گویا وہ خود خالق ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ایسا نہیں سمجھتا کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ یہ احساس غلط ہے اور محض شدت محبت کا نتیجہ ہے۔ اگر لوہے کا ایک ٹکڑا دیر تک آگ میں رکھا رہے تو وہ اتنا گرم اور سرخ ہو جاتا ہے کہ اسے آگ سے ممیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اسی طرح شدت محبت کے اوقات میں عاشق نفس اگرچہ اپنے آپ کو خالق کا مماثل قرار نہیں دیتا، لیکن اس کے باوجود وہ خالق سے اپنے آپ کو الگ سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے۔ لیکن ایسے اوقات طویل نہیں ہوتے۔ عاشق ایک جاں نثار خادم کی طرح اپنی اصل حالت پر واپس آنا چاہتا ہے اور اسی لئے جلد ہی لوٹ آتا ہے۔ اس صورت میں نفس اپنے علم کے سمندر میں گہرا غوطہ لگاتا ہے اور جب ابھر کر سطح سمندر پر آجاتا ہے تو فوراً اپنا اس طرح حاصل کردہ علم اسی مقصد یعنی خدمت محبوب کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ حسن و قوت کے نشے سے سرشار ہو کر اس میں ایک متحرک اور فعال زندگی بسر کرنے کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر تمام دنیا حیران رہ جاتی

© rasailojaraid

ہے۔(ماہانہ اسلامی تعلیم جنوری، فروری، مضمون بعنوان ''تکمیل انسانیت'')

عاشق صادق کی بے نظیر راحت و مسرت کا راستہ

عاشق صادق رضائے محبوب کو خدمت سے حاصل کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے' یعنی اس کے نزدیک محبوب تک رسائی کی کوشش کرتے رہنا واقعی اور بالآخر رسائی سے زیادہ راحت بخش ہے۔عملاً رسائی کے احساس کا مطلب مزید رسائی اور مزید ترقی کا خاتمہ ہے' حالانکہ عاشق کی ترقی اور رسائی کی انتہائی نہیں۔اس کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب تک پہنچے بغیر اس کی جستجو جاری رہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اسے عملاً رسائی حاصل ہوگئی تو اس کی مسرت میں کمی واقع ہو جائے گی۔اس لئے اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ محبوب سے دُور رہا جائے تاکہ وہ اس بے نظیر راحت و مسرت سے ہمکنار رہے جو محبوب تک رسائی حاصل کرنے اور اس کی رضا جوئی کی جدوجہد میں مضمر ہے...... وہ الگ رہنا چاہتا ہے' تاکہ خدمت و عمل کے نو بہ نو مواقع کی بدولت اپنی حاجات پر قابو پاکر رسائی کی کوشش ہمیشہ جاری رکھ سکے اور جب تک دنیا اپنے منتہائے کمال کو نہیں پہنچ جاتی یا جب تک دوسرے نقوش انتہائی خودشعوری کا مقام حاصل نہیں کر لیتے' ایسے مواقع کی کبھی کمی رونما نہیں ہوگی۔(ماہانہ اسلامی تعلیم' جنوری' فروری ۱۹۷۳ء۔مضمون بعنوان تکمیل انسانیت)۔

ایک عضویہ میں زندہ خلیہ دو حیثیتیں رکھتا ہے' اوّلاً یہ اپنی حد تک ایک مکمل فرد اور ایک عضویہ ہے اور اسے اپنی صحت و بقا کی خاطر کام کرنا چاہئے۔ثانیاً یہ ایک ایسے کُل کا جزو ہے جو عضویہ کُل ہے۔اس کی صحت اور عضویہ کی صحت لازم و ملزوم ہیں۔اگر یہ اپنی حد تک کافی صحت مند رہے تو یہ عضویہ کو بھی صحت بخشتا ہے اور اس طرح خود بھی صحت مند بنتا ہے۔جب تک عضویہ کل صحت مند نہ ہو' یہ جزو مکمل طور پر صحت مند نہیں ہو سکتا۔اسی طرح ہر نفس انسانی کی دو حیثیتیں ہیں۔یہ اپنی ذات کی حد تک مکمل فرد بھی ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی ایک کُل کا جزو بھی ہے' جو آخرکار تمام انسانی معاشرے کا کُل ہے۔چنانچہ کوئی نفس انسانی انفرادی طور پر منتہائے کمال کو نہیں پہنچ سکتا' بلکہ اس مقام پر صرف اسی کُل کے

ذریعے سے پہنچ سکتا ہے جس کا یہ ایک جزو ہے۔ چنانچہ عاشقِ شیدا اپنے ذاتی کمالات پر مطمئن نہیں ہو جاتا ہے۔ وہ اس وقت تک اپنے آپ سے غیر مطمئن رہتا ہے جب تک وہ اپنی تمام تر محبت و سعی کے مطابق نسلِ انسانی کے کُل ارتقاء میں مدد نہیں کرتا۔

عاشق صادق کا دنیا میں خالق کے نائب کی حیثیت سے کردار

باقی ماندہ انسانیت کے ارتقاء کے لئے ہر کوشش جو وہ کرتا ہے' اسے اپنے داعیۂ شعور کو تھوڑا سا اور مطمئن کرنے اور انفرادی حیثیت سے خود شعوری کو مزید ترقی دینے کے قابل بنا دیتی ہے۔ یہ طریق کار لامتناہی عرصہ تک جاری رہ سکتا ہے۔ شعورِ انسانی کا داعیہ محض یہ نہیں کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے' بلکہ اس کا داعیہ تمام انسانیت کو کمال تک پہنچانا ہے' کیونکہ شعورِ انسانی کا داعیہ وہی ہے جو شعور ایزدی کا ہے' ظہور یا عرفانِ ایزدی کسی فردِ واحد میں کمال یا منتہا حاصل نہیں کر سکتا۔ فردِ واحد نہیں بلکہ انسانی معاشرہ بحیثیت کل ہی خالق بن سکتا ہے۔ چنانچہ ایک سچا عاشق اس دنیا کو اپنے عمل سے اس طرح بدلتا ہے جس سے یہ اس کے محبوب اور اس کے اپنے مشترکہ مقصد کے لئے بیش از بیش موزوں بن سکے۔ اس کا عمل اس کے محبوب یعنی خالق کے عمل کی طرح تخلیقی ہے۔ وہ زمین پر خالق کے نائب کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ ایسا انسان ہی خالق کا حقیقی وصال حاصل کر سکتا ہے' کیونکہ وہ اس طرح عمل کرتا ہے جس طرح خود خالق دنیا میں پیکرِ انسانی اختیار کر لینے کی صورت میں کرتا... یہ خالق کا مقصد ہی ہے جو کسی شخصیت میں صورت پذیر ہوتا ہے اور دنیا میں سرگرمِ عمل رہتا ہے۔ ہم حضرت موسیٰؑ' بدھ' کرشن' حضرت عیسیٰؑ یا حضرت محمد ﷺ کی صورت میں کسی ایسی ہی شخصیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسا شخص ایک مصلح کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے' وہ جانتا ہے کہ اصلاح کی کس جگہ ضرورت ہے۔ وہ ایک مبلغ کی شکل میں جہالت سے جنگ کر رہا ہوتا ہے' یا ایک شہید کی شکل میں حق کی فتح کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے' یا ایک جرنیل کی شکل میں امن و انصاف کے لئے معرکہ آراء اور ظلم و عداوت کے خلاف شمشیر

© rasailojaraid.com

بکف ہوتا ہے یا بالعموم ایک معمولی دنیا دار انسان کی شکل میں مذکورہ بالا اَبطال سے کسی طرح کم نہیں ہوتا اور وہ دوسرے انسانوں کے سامنے مشکلات میں صبر و عزیمت کے راستے پر چل کر ایک عمدہ مثال قائم کرتا ہے۔ لیکن ایسے اَبطال کو جو خالق کائنات کی محبت سے حرارت حاصل کرتے ہیں، ان مشاہیر سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئے جو غلط نصب العینوں کی محبت و خدمت میں اپنی شخصیت کی نمود کرتے ہیں، کیونکہ ایسے لوگوں کی قربانیاں صرف نصب العین کے لئے ہوتی ہیں اور انسانیت کے لئے یہ بلا واسطہ مفید اشیاء کے مترادف ہوتی ہیں۔ (ایضاً)

عاشق کا سب کے لئے مہربان اور فیاض ہونا اور خوف سے بری ہونا

محبت فرد کی تمام زندگی کو بدل دیتی ہے۔ عاشق اپنے آپ کو حقیقی اور ناقابلِ فنا سمجھتا ہے اس کا سینہ امید، ہمت اور اعتماد سے معمور ہوتا ہے اور وہ دنیا میں امن، سکون اور اطمینان سے رہتا ہے۔ صرف اسی میں ایک بلند شخصیت یا صحیح طور پر اچھا کردار مل سکتا ہے۔ وہ صفاتِ خالق کے رنگ میں گہرا رنگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ تمام نوعِ انسانی کے لئے رنگ، نسل اور قوم کی تمیز کے بغیر مہربان اور فیاض ہوتا ہے۔ وہ صادق القول، ایماندار، بہادر، رحم دل، مضبوط، آزاد، خوددار، شائستہ، ملنسار، عالی ہمت اور بردبار ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خوف جو تمام برائیوں کی جڑ ہے اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔ خوف کا کیا سبب ہے؟ ہم اس لئے خوف کھاتے ہیں کہ مبادا ہم جو کچھ چاہتے ہیں، حاصل نہ کر سکیں۔ جب ہم پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے تو ہم جھوٹ، مکر، فریب، مصلحت، دغا، کینہ، خوشامد، چوری، قتل، بزدلی اور ظلم پر اتر آتے ہیں۔ عاشق کو صرف رضائے محبوب چاہئے اس لئے اسے کسی سے خوف کی ضرورت نہیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی دنیا کی اچھی چیزوں سے اچھے طور پر متمتع ہونا چاہتا ہے لیکن ایسے ذرائع سے جو رضائے محبوب کے مطابق ہوں، ورنہ انہیں سرے سے حاصل ہی نہیں کرتا۔ صرف وہی جانتا ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ اسے اعتماد ہوتا ہے کہ کوششوں میں کمی کے بغیر وہ

.com
com

اس شے کو حاصل کرتا رہے گا جو رضائے محبوب کے مطابق ہے اور جس سے زیادہ اسے کوئی شے مطلوب نہیں۔ محبوب کی رضا اس کی اپنی رضا ہوتی ہے' چنانچہ اسے کسی شے سے خوف نہیں ہوتا' سوائے خود خوف اور اس کی انجام کار برائیوں سے۔ اس کی محبت رضائے محبوب ہے اور یہ شے اسے ہر دوسری محبت سے نجات دے دیتی ہے۔ یہی صحیح معنوں میں آزادیٔ نفس ہے اور صرف یہی کردار کو پاکیزہ بنا سکتی ہے اور فرد کی شخصیت کو ترفع سے آشنا کر سکتی ہے۔ (ایضاً)

ذکر سے حاصل ہونے والی قوّت کو محبوب کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا

اگر مؤمن درحقیقت سچا مؤمن ہے تو ذکر اور تسبیح اور عبادت سے جو قوت اسے حاصل ہوتی ہے وہ اسے مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر ضائع نہیں کرتا' بلکہ دنیا کو اپنے محبوب کی مرضی کے مطابق بدلنے کے لئے کام میں لاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ دنیا کی کوئی چیز نہیں جو خدا کی تسبیح بیان نہیں کرتی۔ اگر انسان ذکر و تسبیح پر ہی اکتفا کرے تو اس کا درجہ جمادات اور نباتات سے بلند نہیں ہوگا' جو بے شعور ہیں یا نیم شعور' لیکن انسان چونکہ خود شناس اور خود شعور ہے' کائنات میں اس کا اصل کردار یہ ہے کہ وہ کائنات کی تعمیر اور تکمیل میں خدا کا شریک کار بنے اور اس غرض کے لئے فقط زبان سے نہیں' بلکہ اپنی مسلسل عملی جدوجہد سے نعرۂ تکبیر بلند کرے۔ زبان سے ذکر اور تسبیح کرنا اس کردار کی تیاری کے ذرائع ہیں' کیونکہ ان سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو اس کردار کو مؤثر طریق پر انجام دینے کے لئے کام آتی ہے۔ افسوس کہ اکثر علماء دین ذکر اور تسبیح پر زور دیتے ہیں' لیکن خدا کی مرضی کے مطابق دنیا کو بدلنے پر زور نہیں دیتے' حالانکہ قرآن حکیم کے ارشادات کی رو سے خدا مؤمنین سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی دنیا کو اس کی مرضی کے مطابق بدلنے کے لئے جدوجہد کریں اور ان سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو اس کی مدد ان کے ساتھ ہوگی۔ (اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہیں نصرت دے گا) خدا کی مدد یہی ہے کہ خدا کائنات کو ترقی دے کر جس کمال پر

© rasailojaraid.

پہنچانا چاہتا ہے' اس کا چاہنے والا مردِ مؤمن بھی یہ کوشش کرے کہ کائنات اس کمال پر پہنچے۔ (حکمتِ اقبال' صفحہ ۲۵۹' ۲۶۰)

خدا کی محبت کے بلند ترین مقام پر پہنچنا اپنے نفس کے ساتھ جنگ کرنے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ انسان کا دل جنگاہ حق و باطل ہے' جس میں اگر حق فتح یاب ہو جائے اور انسان حق پرست بن کر خدا کے عشق کو کمال پر پہنچائے اور خودی میں ڈوب جائے تو اس کا نتیجہ نہایت قیمتی ہوتا ہے۔ انسان کا خودی میں ڈوبنا یا خدا کی محبت میں جذب ہونا گویا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوبنا ہے۔ جب مؤمن اس ڈوبنے کے بعد ابھرتا ہے تو تیغ بے نیام ہو کر باہر آتا ہے اور پھر جس طرح سے اس نے اپنے دل کی جنگاہ حق و باطل میں باطل کا استیصال کر کے حق کو فتح یاب کیا تھا اور خدا کی مخلصانہ محبت کا نقش اپنے دل پر ثبت کیا تھا' اسی طرح سے وہ خارجی دنیا کی رزم گاہِ حق و باطل میں باطل کا استیصال کر کے حق کو فتح یاب کرتا ہے اور خدا کی مخلصانہ محبت کا نقش دنیا پر ثبت کرتا ہے۔ اس طرح سے اس کے وجود کی تیغ بے نیام خدا کی تقدیر کے مقاصد کو پورا کرتی ہے۔

نقش حق اول بجاں انداختن
باز او را در جہاں انداختن

ہر مسلمان کو چاہئے کہ اس کیفیت کو اپنے آپ پر وارد کر کے دیکھے کہ آیا وہ باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے دلیر اور نڈر رہتا ہے یا نہیں اور ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے تقدیر کے مقاصد کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا

(حکمت اقبال' صفحہ ۳۱۹' ۳۲۰)

حقیقت سے واقفیت کے لئے مشاہدۂ حق کے مقام کا حاصل ہونا ضروری ہے

مشاہدۂ حق کے اس مقام پر مؤمن کو ایک علم دیا جاتا ہے' جس سے دین کے رموز

com

واسراراس پرآشکار ہوتے ہیں اور وہ حقائق دینی کا ذاتی احساس کرتا ہے' لہٰذا اس مقام پر وہ احکامِ شریعت اور اصول واخلاق کی پابندی مجبوری سے نہیں' بلکہ ایک ایسی رغبت اور خواہش سے کرتا ہے جس کا روکنا اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اسے قرآن کے مطالب سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی' کیونکہ وہ اصل علوم جو اس کی فطرت میں ودیعت کئے گئے تھے' اس پر عیاں ہو جاتے ہیں اور جب وہ اپنی فطرت کے علوم کو جو اب اس کے لئے ایک زندہ اور متکلم علوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہوتے ہیں' اس قرآن سے جو کتاب کی صورت میں اس کے سامنے ہوتا ہے' مقابلہ کر کے دیکھتا ہے تو دونوں کو ایک دوسرے کے عین مطابق پاتا ہے۔

قرآن نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

﴿بَلْ هُوَ ایٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ (العنکبوت: ۴۹)

''بلکہ یہ قرآن واضح آیات پر مشتمل ہے' جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جو علم رکھتے ہیں''۔

قرآن کی اصطلاح میں علم سے دینی حقائق کی ایسی واقفیت مراد نہیں جو درس و تدریس' تفسیر اور عربی زبان کی لغت اور گرامر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے' بلکہ حقیقت کا وہ ذاتی مشاہدہ' تجربہ یا احساس ہے' جس کی بنا پر ایک انسان خدا اور اس کے فرشتوں کی طرح اپنے ذاتی علم سے قرآن کی صداقت کی گواہی دے سکتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کا علم رکھتے ہیں ان کے لئے قرآن نے اولوا العلم' الراسخون فی العلم' الذین اوتوا العلم اور علماء کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

قرآن کے داخلی علم کے بغیر قرآن کو خارجی ذرائع سے سمجھنے کی کوششیں' خواہ ان میں لغت کی موشگافیوں اور گرامر اور منطق کی باریک بینیوں سے کتنا ہی کام لیا جائے' کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرتیں' بلکہ مضر ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اسلام میں فرقوں کے اختلافات ان ہی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ مطالب قرآن کا اندرونی علم ایسا ہے جیسے دن کے وقت راستہ پر چلنا اور اس کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے لئے ذہنی کاوش سے

© rasailojaraid

کام لینا ایسا ہے جیسے تاریکی میں راستہ ٹٹولنا۔ جو لوگ قرآن کا داخلی علم حاصل کر لیتے ہیں ان کو قرآن کے مضامین و مطالب ازبر ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس علم کے بغیر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ مغز ماری کے باوجود اس کے مطالب پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ (پاکستان کا مستقبل: صفحہ ۴۱، ۴۲، تصنیف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

خودی کا ارتقاء رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور آپ ؐ سے تعلق جوڑے بغیر ممکن نہیں

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے نورِ محبت یا علم سے بہرہ ور ہوں تو ہمیں چاہئے کہ ہم کچھ عرصہ کے لئے عقل بہانہ جو کی کشمکش کو موقوف کر کے رسول اللہ ﷺ کی ذات پر اس طرح سے انحصار کریں جس طرح سے ایک جنین اپنی نشو و نما کے لئے ماں کے جسم پر پورا پورا انحصار کرتا ہے۔ پھر رسول کی پیہم اطاعت کی وجہ سے ہماری خودی کے ارتقاء کا ایک ایسا دور بھی آئے گا جب دین کے اسرار ہم پر کھل جائیں گے اور ہم نیک و بد کا ذاتی امتیاز کرنے لگ جائیں گے۔ ارتقائے خودی کے اس مرحلہ پر ہمیں اعتقاد اور عمل میں رسول ﷺ کے ساتھ ایسی مشابہت حاصل ہو گی جو بیٹے کو شکل وصورت میں اپنے باپ سے ہوتی ہے، کیونکہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی روحانی ابنیت کا فخر حاصل ہو گا۔ قرآن میں بارہا آل (اولاد) کا لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو ایک آقا سے جذباتی اثر یا کسی نصب العین کی محبت قبول کرتے ہیں۔

جس طرح حرارت ایک بلند درجہ رکھنے والے جسم سے گزر کر کم درجۂ حرارت رکھنے والے اجسام میں، جو اس سے چھوتے ہوں، سرایت کرتی ہے یا جس طرح پانی ایک بلند سطح سے بہہ کر ان مقامات کو سیراب کرتا ہے جو اس کے آس پاس نیچے کی سطح پر واقع ہوں، اسی طرح سے زندگی کی لہر اس مقام سے گزر کر جہاں وہ سب سے بلندی پر ہوتی ہے، نوعِ انسانی کو مستفید کرتی ہے۔ خودی کا نور پہلے ایک مقام پر فراہم ہوتا ہے اور پھر وہیں سے اردگرد میں پھیلتا ہے۔ خاتم النبیین ﷺ کی ذات عالم انسانی میں خودی کا بلند ترین مقام ہے، جہاں زندگی کا پانی فراہم ہوا ہے، تاکہ نوعِ انسانی کی فطرت کی پیاس کو

بجھائے۔ اگر ہم زندگی کے پانی سے سیراب ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے سرچشمہ یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ ایک گہرا دلی تعلق قائم کریں، ورنہ ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ (پاکستان کا مستقبل، صفحہ ۸۷)

رسمی اطاعت اور شدید محبت کے زیر اثر اطاعت کے درمیان فرق

ان تصریحات سے اگر یہ پتہ چلتا ہے کہ خودی کا ارتقاء رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اطاعت جو ایک شدید محبت یا قلبی تعلق کا نتیجہ نہ ہو اور محض ایک رسم یا عادت کی صورت میں رہ گئی ہو وہ ارتقائے خودی کے لئے مفید نہیں۔ کیونکہ دراصل وہ اطاعت ہی نہیں، بلکہ پابندیٔ رسم یا زورِ عادت کا ظہور ہے۔ بظاہر رسمی یا عادی اطاعت محبت والی اطاعت سے مختلف نہیں ہوتی۔ لیکن درحقیقت پہلی قسم کی اطاعت ضعف عقائد کا نتیجہ ہے اور پھل کے ایک چھلکے کی طرح ہے، جو بظاہر پھل نظر آتا ہے لیکن مغز سے خالی ہوتا ہے۔ اگرچہ اس قسم کی اطاعت بھی جسمانی تکلیف کے بغیر نہیں ہوتی، تاہم انسان کی خودی کی تربیت نہیں کرتی اور اسے روحانی ترقی کی منزلوں پر آگے نہیں لے جاتی، بلکہ کولہو کے بیل کی طرح وہیں کا وہیں رکھتی ہے۔ دوسری قسم کی اطاعت پختگی عقائد سے پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اس کا منبع ایک اندرونی جذب یا کشش ہوتا ہے اور وہ ایک بے ساختہ قدرتی عمل کی صورت اختیار کرتی ہے اس لئے اس میں مؤمن کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ یہ نوافل کی صورت میں رفتہ رفتہ اپنا پھل لاتی ہے۔ یعنی مؤمن کی محبت میں اضافہ کر کے اسے نوافل پر مائل کرتی ہے اور وہ خود بخود نوافل میں اضافہ کرتا جاتا ہے اور ان میں ایک دلی رغبت محسوس کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے فرائض سے کم ضروری نظر نہیں آتے۔

جن عبادات کو نوافل کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت فالتو اور غیر ضروری نہیں، جیسا کہ ہم میں سے بعض کا خیال ہے، وہ حد درجہ ضروری ہونے کے باوجود نوافل اسی لئے ہیں کہ ان پر مجبور کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ فرائض کی مخلصانہ ادائیگی سے جو مقامات

© rasailojaraid

مؤمن کی خودی کو یقینی طور پر حاصل ہوتے جاتے ہیں ان مقامات پر وہ ایک زبردست اندرونی کشش کے ساتھ ان نوافل کی طرف زیادہ سے زیادہ شدت کے ساتھ مائل ہوتا جاتا ہے اور اس طرح سے اپنی ترقی کا سامان خود بخود پیدا کرتا جاتا ہے' یہاں تک کہ بنیادی احکام یا فرائض کے اندر جو انتہائی مقاصد مخفی ہیں' ان کو خود بخود پا لیتا ہے۔ شارع علیہ السلام نے مؤمن کی آزادانہ ریاضت اور عبادت کے لئے بہت سا میدان چھوڑ دیا ہے' کیونکہ خودی کی آزادانہ اختیاری جدوجہد اس کی انتہائی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ پس مخلصانہ اطاعت سے انسان کی خودی اپنے ارتقاء کی منزلوں کو طے کرتی جاتی ہے' یہاں تک کہ انتہائی منزل پر جا پہنچتی ہے۔ جہاں اسے کہا جاتا ہے:

﴿يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ (الفجر: ۲۷۔۳۰)

''اے روحِ مطمئن! اپنے پروردگار کی طرف چل۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ میرے بندوں میں شامل ہو اور میری بہشت میں داخل ہو جا''۔ (ایضاً صفحہ ۸۹)

قدرت کے مقاصد کے لئے عدم استعمال کی وجہ سے گرائے جانے کا خطرہ

خواہ ہم اسلام سے کتنے ہی روگرداں ہوں اور خواہ یہ بات ہمیں اس وقت کیسی ہی مشکل نظر آئے' لیکن اسلام پھر بھی اس دور کے غلط نظریات پر جو اسے برباد کر دینے پر تلے ہوئے ہیں' غالب ہو کر زندہ رہے گا۔ البتہ یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ہم سازگار حالات کے باوجود جو قدرت ہمارے لئے پیدا کر رہی ہے' قدرت کے ارادوں کے ساتھ تعاون کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس صورت میں ہم مقاصدِ ارتقاء کے لئے بیکار بلکہ مضر سمجھ کر نظروں سے گرا دیئے جائیں گے۔ سلطنت کی نعمت ہم سے چھین لی جائے گی اور ہمیں ذلت کی زندگی بسر کرنے اور آخر کار مٹ جانے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا اور ہماری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کر دیا جائے گا' جو اسلام کی خدمت کرنے اور لوگوں کی ملامت سے بے پرواہ ہو کر زمانہ کے باطل کے ساتھ ٹکر لینے کے

.com

لئے تیار ہو گی، پھر سلطنت، دولت، علم اور دنیا کی تمام نعمتیں اسی قوم کو دے دی جائیں گی ۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ محض میرے تخیل کی پیداوار نہیں، بلکہ قرآنِ حکیم کی متعدد آیات اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ﴾ (المائدة: ٥٤)

''مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین سے منحرف ہو جائے تو خدا کو اس کی پرواہ نہیں ۔ وہ ایسے لوگوں کو پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور وہ اسے دوست رکھیں گے، مسلمانوں کے حق میں نرم اور کافروں کے حق میں سخت ہوں گے، خدا کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کا باک نہ رکھیں گے'' ۔

﴿اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾ (محمد: ٣٨)

''اگر تم اسلام سے منحرف ہو جاؤ تو خدا تمہیں مٹا کر تمہارے عوض میں اور قوم لائے گا، پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے'' ۔ (ایضاً صفحہ ۹۵)

اسلام کے کامل نظریئے کو اختیار کرنے والی ریاست کا مستقبل

بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ پاکستان ایک کمزور اور چھوٹا سا ملک ہے، جو بالخصوص ایٹم بم کے اس زمانہ میں دنیا کی بڑی طاقتوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، لیکن قوموں کا عروج وزوال نہ تو اُن کے ظاہری مادی اسباب پر منحصر ہے اور نہ ان کی قوت سعی وعمل پر، بلکہ اس کا دارومدار کائنات کی باطنی قوتوں کے عمل پر ہے ۔ جو قوم بھی ان قوتوں کے نہ رکنے والے عمل کو اپنے موافق اور مطابق کرے گی وہ زندہ رہے گی اور دوسری قومیں خواہ ان نظریات کے ظاہری اسباب کچھ ہوں، مٹ کر فطرت کی اس چہیتی قوم کے لئے راستہ صاف کر دیں گی ۔ جس طرح سے ایک فرد کی خودی کے اندر جذبۂ حسن وکمال موجود ہے، اسی طرح سے کائنات کی ساری ارتقائی حرکت اس جذبہ کے اظہار و اطمینان کے لئے ہے ۔ اور قدرت نے انسان میں جو جذبۂ حسن و جمال رکھا ہے وہ بھی

© rasailojaraid

اسی غرض سے ہے کہ انسان اس کے ساتھ مل کر کام کرے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ جو قوم کائنات کے اندرونی جذبۂ حسن و کمال کی مؤید ہوگی' دوسرے الفاظ میں جو قوم آخرکار کامل نظامِ تصورات کو اپنی زندگی کی حقیقی بنیاد بنائے گی وہ روئے زمین پر حکومت کرے گی' کیونکہ اس کے ظاہری حالات خواہ کیسے ہی مایوس کن ہوں فطرت اسے عروج و کمال پر پہنچانے کے لئے بے تاب ہے۔ اگر وہ تہی دست و نادار ہو گی تو دولت دوسروں سے چھین کر اسے دے دی جائے گی۔ اگر اس کے پاس سامانِ جنگ نہ ہوگا تو اسے اجازت دے دی جائے گی کہ دوسروں کا سامانِ جنگ چھین کر اپنے قبضہ میں لے لے۔ اگر وہ بے علم و بے ہنر ہوگی تو اسے علم و ہنر سے آراستہ کیا جائے گا۔ اگر وہ عمل سے محروم ہوگی تو دوسروں کے ہاتھ پاؤں شل کئے جائیں گے اور اسے قوتِ سعی و عمل سے نوازا جائے گا۔ قدرت ان تمام ترقیوں سے جو وہ نوعِ انسانی کو آج تک نصیب کرتی رہی ہے' صرف ایک قوم کی تعمیر کرنا چاہتی ہے اور وہ خاتم النبیین ﷺ کی اُمت ہے۔ اگرچہ اس قوم کی تعمیر کے سامان کا بہت سا حصّہ اس وقت دوسری قوموں میں بکھرا ہوا ہے' لیکن بالآخر وہ یکجا کر کے اسی قوم کے سپرد کیا جائے گا۔ مسلمان مطمئن رہیں کہ جو کچھ دنیا پیدا کر چکی ہے وہ ان ہی کا ہے اور جو کچھ دنیا نے ابھی تک پیدا نہیں کیا' وہ خود پیدا کرنے والے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اسلام کو فی الواقع ایک کامل نظامِ تصورات کی حیثیت سے کام میں لائیں' یعنی اپنی سیاسی زندگی کی روحِ رواں بنائیں۔ (پاکستان کا مستقبل' صفحہ ۹۹)

قوموں کا ایک دوسرے کے ساتھ تصورات کی جنگ میں مبتلا ہونا

اسلام اور اسلامی تصورات کی تبلیغ کا مسئلہ خود ہمارے لئے اس دنیا میں بھی زندگی اور موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر' بلکہ اس میں ڈھیل اور سستی کرنے سے بھی ہم ایک قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم دوسری قوموں کو مغلوب نہیں کریں گے تو یقینی بات ہے کہ ہم خود ذہنی طور پر اُن سے مغلوب ہو جائیں گے اور ذہنی غلامی ہمیشہ سیاسی غلامی کا پیش خیمہ ہے۔

id.com

اس زمانہ میں قومیں اپنے نظریاتِ زندگی کی بنا پر متحد ہو رہی ہیں۔ ہر قوم چاہتی ہے کہ اپنے نظریۂ زندگی کو ماننے والے افراد یا اقوام کی تعداد میں اضافہ کر کے اپنے آپ کو اور طاقتور بنائے۔ اس غرض کے لئے وہ پروپیگنڈا کے تمام جائز یا ناجائز ذرائع کو کام میں لاتی ہے۔ جس حد تک کوئی قوم کسی دوسری قوم کے نصب العین کے اثرات کو قبول کرتی ہے اس حد تک وہ خود کمزور ہو جاتی ہے اور اس کی حریف قوم طاقتور ہو جاتی ہے اگرچہ وہ قوم اپنی کمزوری یا حریف قوم کی طاقت کا فوری احساس نہ کرے۔ ہر قوم دوسری قوم کی دشمن ہے اور اس کی قوت کو سلب کر کے اپنی قوت میں اضافہ کرنا چاہتی ہے' لہٰذا اس کے ساتھ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں مصروف رہتی ہے۔ قومیں توپ و تفنگ کے ساتھ تو شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کے مقابلہ پر آتی ہیں' لیکن تصورات کے آلات کے ساتھ وہ ہر آن اور ہر لمحہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں اور تصورات کے حملے توپ و تفنگ کے حملوں سے کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ (اسلام کا نظریۂ تعلیم' صفحہ ۳۶۔ تصنیف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

قوموں پر ذہنی محاذ کی شکست کے اثرات

جب ایک قوم ذہنی محاذ پر شکست کھا جاتی ہے تو خواہ اس کی فوجی طاقت کیسی ہی زبردست ہو' وہ فوجی محاذ پر لڑنے کے قابل نہیں رہتی' بلکہ خود بخود ہتھیار ڈال کر دشمن کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی قوم ذہنی محاذ پر اپنے آپ کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ تھوڑی فوج کے ساتھ دشمن کی فوج کو شکست دے لیتی ہے۔ اور اگر دشمن اسے فوجی لحاظ سے مغلوب بھی کرے تو اس کا غلبہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس حقیقت سے پتہ چلتا ہے کہ ذہنی محاذ فوجی محاذ کے مقابلہ میں کس قدر زیادہ اہم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دشمن پر حملہ کرنے میں پہل کرنا دشمن کے حملہ سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ ہے۔ یہ اصول جس قدر فوجی محاذ کی صورت میں درست ہے اسی قدر ہی ذہنی محاذ کی صورت میں بھی درست ہے۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے ہمارے دشمن مدت سے ہمارے خلاف اپنے تصورات کے حملہ کو شروع کر چکے

© rasailojar

ہیں۔ اگر ہم اس حملہ کا مؤثر جواب نہ دیں تو ہماری زندگی خطرہ میں رہے گی۔ اپنی قوم کو دوسری قوموں کے غلط تصورات کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم فوراً دوسری قوموں کے خلاف علمی اور عقلی تصورات کے پُر امن آلات کے ساتھ جارحانہ کارروائی کا آغاز کریں اور جب تک ہمیں مکمل غلبہ حاصل نہ ہو جائے اسے متواتر جاری رکھیں، ورنہ ان کے تصورات کا اثر ہمارے اعتقاد اور یقین کو سلب کرتا چلا جائے گا اور ہم ذہنی اور سیاسی لحاظ سے کلیۃً مغلوب ہو جائیں گے۔

ذہنی کارزار میں فی الفور اپنی پوری قوت کے ساتھ اترنے میں پیش قدمی نہ کرنے کا سبب یا تو ہماری لاعلمی ہے کہ ہم جانتے ہی نہیں کہ ہم پر کوئی دشمن حملہ آور ہو رہا ہے اور ہمیں اپنی محافظت اور مدافعت کی ضرورت ہے، اور یا پھر ہم اس حملہ کے ممکن نقصانات کا اندازہ نہیں کر سکتے اور اپنے آپ کو اس قدر مضبوط اور مستحکم سمجھتے ہیں کہ کسی مدافعت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اس وقت ہماری قوم میں جس قدر اختلافات موجود ہیں وہ غیر اسلامی نظریات کے اثر کا نتیجہ ہیں۔ اشتراکیت، قومیت پرستی، نسل پرستی اور صوبہ پرستی کے امراض جس حد تک ہمارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے پھیلنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلامی تصورات کی محبت سے محروم ہو گئے ہیں، کیونکہ اب تک اس محبت کی رَو کو تازہ بتازہ جسدِ ملت کے ہر ایک حصہ تک پہنچاتے رہنے کے لئے ہمارے پاس کوئی نظامِ تعلیم موجود نہیں تھا اور جس حد تک ہم اسلامی تصورات کی محبت سے محروم ہوئے ہیں اسی حد تک غیر اسلامی تصورات کی محبت ہمارے دل میں متمکن ہو گئی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۷، ۴۸)

قوموں کی جیت اور ہار کا اصل میدان

اگر ہم نے اپنے ملک کے لئے ایک اسلامی نظامِ تعلیم کی تعمیر میں دیر کی تو ہم اعتقادی اور اخلاقی لحاظ سے دن بدن کمزور ہوتے چلے جائیں گے۔ کسی قوم کی اعتقادی یا اخلاقی قوت یعنی نصب العین کی محبت اس کی تمام قوتوں کا سرچشمہ ہوتی ہے، اس پر قوم کی وحدت اور تنظیم کا دارومدار ہوتا ہے اور اسی کی بنیادوں پر قوم کی فوجی اور

اقتصادی قوت تعمیر پاتی ہے۔ اگر نصب العین کی محبت کمزور ہو جائے تو قوم کی ساری قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔

ہم چاہیں یا نہ چاہیں لیکن ہم دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دوڑ میں شریک ہیں جس میں ہر قوم نے جان کی بازی لگا رکھی ہے۔ جو قوم اس دوڑ میں ہار جائے اس کی سزا یہ ہے کہ اسے مٹا دیا جاتا ہے اور جو جیت جائے اس کا انعام یہ ہے کہ دوسری قومیں اس کی غلام بنا دی جاتی ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم اِس دوڑ میں جیت رہے ہیں یا ہار رہے ہیں۔ ہر دوڑ کی طرح اس دوڑ میں بھی وقت کا پہلو نہایت اہم ہے۔ جو قوم وقت ضائع کرے گی، خواہ وہ کیسی ہی طاقتور ہو، ضرور ہار جائے گی۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ دوسروں کے تصورات اور معتقدات کا سیلاب ہمیں گھیرتا چلا جائے گا، اور اگر ہم نے عجلت سے کام لیا تو ہم نہ صرف اس سیلاب سے محفوظ رہیں گے، بلکہ ہمارے اعتقادات و تصورات کا سیلاب دوسروں کو اپنے گھیرے میں لے لے گا۔ افسوس ہے کہ ہم نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح نہیں سمجھا کہ تعلیم کا معاملہ محض تعلیمی نوعیت کا نہیں، بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے اور ہماری زندگی اور موت اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ (اسلام کا نظریۂ تعلیم، صفحہ ۳۸، ۳۹)

کسی قوم کی تاریخ میں زندگی اور موت کو پیدا کرنے والے عوامل کے اثرات چند سالوں، بلکہ بعض وقت چند صدیوں میں بھی نمودار نہیں ہوتے، لیکن اس کے باوجود یقینی طور پر نمودار ہوتے ہیں اور ان کا اثر روکا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی قوم زندہ ہو رہی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ دنیا اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ آج کرے یا چند صدیوں کے بعد، دنیا ضرور اُس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ کرے گی۔ اسی طرح سے اگر کوئی قوم مر رہی ہے تو یہ معمولی بات ہے کہ لوگ اس کی موت کا نظارہ آج دیکھیں یا کچھ عرصہ کے بعد، اس کی موت لامحالہ دنیا کے سامنے آ جائے گی۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم مر رہے ہیں یا زندہ ہو رہے ہیں۔ دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا ہم اپنے اعتقادات کی حفاظت نہ کرنے سے ذہنی طور پر دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور پھر ہماری سیاسی

© rasailojaraid

آزادی بھی خطرہ میں پڑ جائے گی اور یا پھر ہم اپنے معتقدات سے دوسروں کو ذہنی طور پر مغلوب کر کے ان کی سیاست پر غالب آ جائیں گے۔ موت اور زندگی، غلامی اور آزادی کی راہوں کے درمیان دنیا کی کسی قوم کے لئے کوئی مقام نہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہمارا رُخ کس طرف ہے، ذہنی آزادی کی طرف یا ذہنی غلامی کی طرف، زندگی کی طرف یا موت کی طرف؟ اب بھی ہم اپنے نظامِ تعلیم کو بدل کر اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق نہیں بنا سکے تو ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نہایت ہی دلخراش اور اندوہناک ہے۔

آزادی وغلامی اور شکست وفتح کا اصل فلسفہ

کسی قوم کا امتیازی نشان جو اُسے دوسری قوموں سے الگ ایک قوم بناتا ہے اور اس کی ہستی کا ثبوت ہوتا ہے، وہ اس کا اعتقاد یا اس کا تصورِ حیات ہی ہوتا ہے۔ غلامی اصل میں ذہنی غلامی ہے اور آزادی ذہنی آزادی۔ جو قوم سیاسی غلامی کے باوجود اپنے نظریۂ زندگی پر قائم رہ سکتی ہے اور اسے فی الواقع اپنے فکر و عمل کا مدار و محور بنا سکتی ہے، وہ درحقیقت آزاد ہے۔ اس کے برعکس سیاسی آزادی کے ہوتے ہوئے جس قوم کے فکر و عمل کی بنیاد غیروں کے معتقدات پر ہو، وہ آزادی کے باوجود غلام ہے۔ سیاسی آزادی کسی قوم کے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہوتی، بلکہ ہر قوم سیاسی آزادی کو اپنی ذہنی آزادی کی خاطر حاصل کرتی ہے۔

اسی طرح سے ہر قوم کی شکست ذہنی شکست ہے اور فتح ذہنی فتح ہے۔ کوئی قوم فوجی شکست سے اس وقت تک پریشان نہیں ہوتی جب تک اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی شکست ہوگا اور کوئی قوم فوجی فتح سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی فتح ہوگا۔ لیکن قوموں کی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے فوجی شکست ہمیشہ ذہنی شکست پر اور فوجی فتح ہمیشہ ذہنی فتح پر ختم ہوتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۰)

(جاری ہے)

.com